

اچکا کر بے بسی کا اظہار کیا۔ شاہ رُخ کی اُس حرکت کا اثر تھا کہ اپنی آواز کی بے جوابی کا حکس، اسد کا خصہ جس سُرعت سے چڑھاتا، اُسی تیزی سے مُحنڈ پڑ گیا۔

”یا شاید اُسے یہ خدا ہے،“ اسد متوازن آواز میں بولا، ”کہ میں اُس کی کاگزاری لوگوں میں بیان کر دے گا۔“

”نقضِ امن کا جلد کسی بھی مقصد کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔“ شاہ رُخ نے کہا، ”قاون نے اس سلسلے میں انہیں دیکھ اختیارات دیے ہیں۔“

”مگر میں وہاں.....“

شاہ رُخ گویا اُس کے دل کی بات جان گیا۔ یا سہیں اب بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ اسکی بات کا د کر بولا، ”اس پر صدمہ کے اثرات کافی حد تک زائل ہو گئے ہیں۔ کچھ اُن کے مزاجوں نے ما تھا پاؤں نکلتے شروع کیے تھے۔ میں نے انہیں دبایا ہے۔“

غصہ ایک بار پھر اسد کے دل میں اُچھال مارنے لگا۔ مگر اب کے یہ غصہ ایک نہدھی نہدھائی، باضبط صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ شاہ رُخ اُس کے پاس گیا ہے ہے جاتا رہتا ہے ہے کتنی بار ملا ہے ہے وہ سوچنے لگا۔ یا سہیں نے شاہ رُخ سے میرے بارے میں پوچھا ہے؟ وہ اب بجھ سے بلنے تو آ سکتی ہے۔ آقی کیوں نہیں؟ شاہ رُخ نے اُسے بتایا ہے؟ — جب اس کا دل اس اُچھال کی کوہاں پر اٹھتا تو ایک ایک کر کے یہ سوال اُجھرتے۔ پھر ذوب جاتے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُسے گُشہ جانے سے روکا جا سکتا ہے۔

”مگر میں وہاں رہتا ہوں۔“ وہ بے سمجھ آوانہ میں بولا، ”علاج کردار ما ہوں۔“

”علاج کرنے والا تو چیل بسا۔“ شاہ رُخ نے کہا، ”پولیس کر خواہ مخواہ چیلنج کرنا مناسب نہیں۔ اس قسم کو اب - - -“

”مناسب نہیں!“ اسد بولا، ”یہاں پر کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں۔ بے گناہوں کو پکڑنا مناسب ہے؟ میری بے گناہی ثابت ہو چکی ہے۔“

”یہ بات نہیں۔“ شاہ رُخ نے صبرے کہا، ”تمہارے ذاتی تحفظ کے لیے بھی نقضِ امن لگو ہو سکتا ہے۔“

”ذاتی تحفظ تو مجھے اُسی روز حمل ہو گیا تھا جب میں اُن کی قید سے چھڑا تھا۔“ اسد طنز سے بولا، ”گُشہ میں مجھے کیا خطرہ ہے؟“

”میں ان کا نقطہ نظر بیان کر رہا ہوں۔“

”تمہارا نقطہ نظر کیا ہے ہے؟“ اسدہ تیری سے بولا، یا تمہارا کوئی نقطہ نظر نہیں ہے جواب میں اسد کو شاہ رُخ کے فرانخ چہرے پر کھلی ہوئی بے صوت آنکھیں ملیں، جن میں نسل درسل احیثت کی خاموشی اور اطمینان تھا۔

اس نے چین بھیں ہو کر کمرے میں ایک نظر در طرفی کوئی حیلہ۔ کوئی حیلہ۔ جب اُسے اور کچھ کہنے کو مجبلاً تو بولا: ”میرا سامان دہاں پر ہے۔“

شاہ رُخ کی آنکھوں کا رُخ مbla، اسد کی نظروں نے ان کا پیچھا کیا، پھر اس نے جلدی سے خجک کر چدا پائی کے نیچے نظر والی تو اس کا سامان پڑا تھا۔ کالا ڈرپک، متعفی، اور پکبل کا چھوٹا سا بچو، سب سے اور پر بڑوں کا ایک جزو، سب چیزیں ادوائیں کی رئی سے کنس کر ایک گھٹھڑی کی صورت میں باندھ دی گئی تھیں۔ وہ حیرت سے آنکھیں چڑائے، شاہ رُخ کو دیکھتے ہوئے، اتحاد چارپائی کے نیچے لے جا کر اپنے سامان کو سُرتا رہا، بہت آہت آہت، اس کا دل بیٹھ گیا۔

پکھ دیر خاموش رہنے کے بعد اسد نے کہا: ”تم کچھ نہیں کر سکتے ہے؟“

”میں نے پوری کوشنہ کر کے دیکھ لی ہے۔“ شاہ رُخ نے کہا اور انہوں کھڑا ہوا۔ وہ چارپائی کے پاس کھڑا بید دروازے کو دیکھتا رہا۔ ”ذوالفقار نہیں آیا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”بیٹھکہ بیباں سے کتنی دُور ہے؟“ اسد نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

”پانچ میل۔“ شاہ رُخ نے جواب دیا۔ ”کل اؤں گا۔“ وہ ہاتھ ہرا میں لہرا کر دروازے سے نکل گیا۔ باہر حابر اس نے آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا۔

اس وقت ایک بار پھر اسد پر وہ دلا دینے والا، بے بسی اور تنہائی کا احساس طاری ہونے لگا۔ اُسے لمحسوں ہرا کہ اُس کے وجود کی جویں ہلنے لگی ہیں، ان میں خلا پیدا ہو گئے ہیں اور ہوانہ سچ سے نکل جا رہی ہے اور دُر دُر تک کوئی ان پر ہاتھ رکھنے والا نہیں۔ وہ بستر پر ڈھنک گیا۔ اس نے کبل سے اپنے اپ کر دھانپ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذوالفقار دروازہ کھول کر اندر دخل ہوا، اسد کو سویا ہوا پا کر آہستہ قدم رکھتا کمرے کے درست تک آیا اور جنم منٹ تک رکارہ۔ اسد نے سر اٹھایا: آنکھیں کھولیں۔ اس میں آنی ہمت نہ رہی تھی کہ ذوالفقار کا سامن کرتا پکھ دیر کے بعد اس نے پھونک سے یہ پس بھانے کی آواز سنی۔ پھر قدموں کی چاہپ باہر نکل گئی اور

دروازہ بند ہو گی۔

خواب میں اُس نے بند دروازے اور یا سکین کے کھلی کھلی انکھوں والے بے تکونی چہرے دیکھے۔ پھر اُن کی دھلان پر وہ رُٹھک رہا تھا۔ کرنی شے دل سے تکل گئی تھی، اگر پتا نہیں چلتا تھا۔ دل کیک شکجھے میں تھا۔



”میں آج باہر جاتا ہوں۔“ صبح سوریے ذوالفقار نے اسد سے کہا، ”رات کو دیر سے واپس آؤں گا۔ کریم کو کہہ دیا ہے۔ تمہارا کھانا تیار کر دے گا۔ آرام کرنا۔“

اسد چار پائی پہ بیٹھا، دودھ والی اُلبتی ہوئی کشیری چانے کا بڑا سا پیارہ کپڑے بھیلی سی ڈبل روٹی جگہ جگہ کر کھا رہا تھا۔

”کل رات کو شاہ رُخ۔۔۔ اس نے کہا۔ شرمند ع کیا۔

”ہاں۔“ ذوالفقار نے اُس کی بات کافی کر کہا، ”میں واپس آرہتا ہو تو ملاقات ہوئی تھی۔ شام کو آئے گا۔“

ذوالفقار کرنسی پہ بیٹھا سکرپٹ پل رہا تھا۔ اُس کا دھلا دھلا، دارلحی منڈا صحت نہ چہرہ ایک متقد اور فرض شناس شخص کا چہرہ تھا۔ صرف اُس کی گول گول تیز انکھوں میں کسی ایسے جنپے کی چمک تھی جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرنی تھی۔ اُسے دیکھتے ہوئے اسد کو بل دجہ شاہ رُخ کا چہرہ یاد آیا۔ شاہ رُخ کا چہرہ نسبتاً خوبصورت اور فراخ تھا، اگر اُس میں کوئی خاص بات نہ تھی، جیسے کہ اُس کے پیچے کی زمین پاٹ ہو۔ اُس کا چہرہ ایک سرکاری طازم کا چہرہ تھا، ذہین، خداخوت، کسی حد تک با اصول۔ اُس پر تندر ڈال کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ پاٹ زمین خیر اباد اور ذخیر ہے، اسے قبضے میں لے کر کچھ بھی یہاں کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی کا چہرہ تھا جسے ہمول کے نام پر حکم دے کر بے مثال سقاکی کا اہل بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد ذوالفقار کا چہرہ سنتگلاغ نہیں پر قائم تھا۔ اُس نہیں پر بے شمار زیر دربم، دھوپ سائے، خدار جھاڑیوں کے نشان بلتے

نئے۔ یہ احساس ہوتا تھا کہ مستعد ہی اور فرش شناسی کے ملاوہ کوئی اور قوت بھی ہے جو اس شخص کی خوبیوں کو مصروفی سے تخلیے ہوئے ہے۔ یہ کون سی شے تھی ہے علم ہے جنون ہے جبر ہے۔۔۔ اس چہرے کا ایک ذہن تھا۔ یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جن کے اور پر شکوہ حکومتوں کے جو ہدایتے ہیں۔ اس چہرے پر جبر سما کیا جاسکتا تھا اس دل کے دل میں اچھا کم، پہلی بارہ، ذوالغفار کے اور پر اعتماد کا خذیرہ پیدا ہوا۔

”میں گشید کیوں نہیں جا سکتا ہے ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بہبہ ہے“

”گشید میں سرا دلخہ کیوں نہیں ہے؟“

”تمہاری حفاظت کا معاملہ پولیس کے پیش نظر ہے۔“

”مجھے کس سے خطرہ ہو سکتا ہے؟“

”حکیم کے پھر زار سے پہلے ہی سرانجام پکے ہیں۔ شاہزاد کی مداخلت سے معاملہ رفع و فتح ہو گیا ہے۔“

”میں گل پھر بھی کاؤں کی اپنی لڑکی ہے جیسے یہیے قیمتی حالات کے مطابق رہنا پسکھ لے گی۔ تمہارا معاملہ مختلف ہے؟“

”یکے ہے“

”تم اجنبی ہو۔ جرم اور سزا کا معاملہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ ایک طرف یہ سراسر فالنی معاملہ ہے تو دوسرے اندھرے میں جاتا ہے۔ اب اگر خوشی محدث کا جرم ثابت ہو جاتا ہے اور اسے سزا ہو جاتی ہے، تو بھی تمہارے خلاف ان دینہاتیوں کا تعزیز قائم ہے گا۔ مجھے تیکن ہے کہ ان میں سے کوئی ایسے بول گئے جو افری دم تک خوشی محدث کرے گناہ بھی سمجھیں گے۔“

پیری بے گناہی ثابت ہو چکی ہے، اس نے کہنا چاہا۔ مگر زبانِ رف کے ذوالغفار کو دیکھا رہا۔

”پھر اگر تم اپنی لوگوں کے درمیان جا کر، اُسی کھر میں رہنا شروع کر دو تو معاملہ ذرا ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔“ بشیک

”اس کا ایک اور رخص بھی ہے۔ پولیس نہیں چاہتی کہ ان کے اور پر بھی کسی قسم کا کوئی حرف آئے۔“

”میں پولیس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”تمہیں علم ہے یہ علاقہ اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔ ان حالات میں کسی چھوٹی سے پھری مہمنی کا رسک بھی نہیں دیا جاسکتا۔ یہ قوم اس وقت جس سرحد پر ہے اُس کو اگر ہم نے کامیابی سے اتحاد ٹیز کا مسئلکہ کر لیا تو اس کے لیے پہلی شرط ہے۔“

”اتحاد ٹیز؟“ اس نے اپنے بھائی سے دہراتا۔ ”اتحاد ٹیز تو نظم و نسق چلانے کے لیے ہر قی ہیں۔ تو میں

کے مرحلے کیسے سر کر سکتی ہیں ہے

ذوالفقار کے چہرے پر علی سی پر اعتماد مکرا بہت ظاہر ہوتی۔ پر اپنکنڈا، میرے دوست جو تمہیں اخبارِ دن
اور کتابوں میں ملتا ہے، وہ سیاست کے مرحلے ملے کرتا ہے زنجک کے۔ قوم۔ جمہوریت۔ انقلاب۔ یہ سب
کیا ہے ہے؟ اُس کا ہاتھ ایک لمحٹکے کے لیے ہوا میں اٹھا اور ایک لمحے سے دھماکے کے ساتھ میر پر آ رہا۔ لکھن،
وہ فیصلہ کن انداز میں بولا، ”ایک نہ رکتا ہیں تھکنی جاتی ہیں تو ایک دوسری عمل آتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے انقلابوں
میں لاکھوں آدمیوں کو، انقلاب کے پاہیوں کو مرد اور نسوان ضروری سمجھا گیا۔ کیوں ہے؟ دسپن۔ تمہیں علم ہے کہ اس
وقت بڑی بڑی نامور انقلابی حکومتوں کو کون چلارہا ہے؟ اُس نے اعلانیہ انداز میں اٹھا ہیں اٹھائی، ”ملٹری۔
ذوالفقار کی آنکھوں کی پرشییدہ آگ چمک اٹھی تھی۔ اسد اُس کے جذبے کے چینگل سے چینگل کے
لیے ما تھپا دل مار رہا تھا۔

”اس قوم کو اب قیادت اور کنٹرول کی ضرورت ہے۔ — ”ذوالفقار کہہ رہا تھا۔

” مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہے؟ ” اسد نے کہا۔

ذوالفقار نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔ ”ٹھیک ہے۔ تمہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہے
 تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔ مگر تم جانما ہی چاہتے ہو تو بہتر ہی ہے کہ واپس اپنے گاؤں چلے جاؤ، اور یا سیکن کو خلط کئوں
کر جاؤ۔ وہ اپنی جائیداد وغیرہ نیچنے کا بندوبست کر سکتی ہے۔ — بشرطیکر وہ جانا چاہے؟ ”
” وہ جانا چاہتی ہے؟ ” اسد نے جلدی سے کہا۔

” تمہیں یقین ہے وہ جانا چاہتی ہے؟ ” ذوالفقار نے مسکرا کر لوچا۔

” ہاں۔ مجھے یقین ہے۔ جائیداد کا بندوبست کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ ” اسد نے بات بنائی،
” مگر سب سے پہلے مجھے اپنی دواخصل کرنی ہے۔ اس کے بغیر میرا زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔ یا سیکن کو۔ ”
ذوالفقار کی ہنسٹی ہر فی، تھٹھا کرتی ہوئی آنکھوں کے سامنے اُس کا حرم ٹوٹنے لگا۔ اُس نے مشکل جلد پورا کیا،
” اس دو اکا علم ہے۔ ”

کھلنے دروازے سے صبح کی دھوپ میں طبوس پہاڑ کی چڑی پشت نظر آرہی تھی۔ چکر چکر پر گھنے بلند
درختوں کے جنگل میں جو دوسرے جنگل سیاہ جھاڑیوں کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ اسد کی طویل، تھہری ہر فی نظر
ان پر آگی رہی۔ کوئی حیلہ، کوئی پہاڑ؟ آسمان کا رنگ کس قدر صاف ہے، اس نے حیرت سے سچا۔
صاف اور نیلا۔ اتنا خالص اور شورخ رنگ آسمان کا یہی نئے کبھی نہیں دیکھا۔ اسد کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ

بے گھر بیوگیا ہے۔ گشاد کا نقشہ اس کی آنکھوں کے آگے ہے اگر دھمیر گپا۔ سخنان دیواروں سے لپٹی ہوئی دھوپ سائے کے علم میں تھی، اور ہر دیوار کے ساتھ ایک بی صدمت کھڑی تھی۔ اسد کا دل جلت کی جانب لپکایا ہے! اس نے آنکھیں آٹھا کر ایک پیلی سی نظر آسمان پر ڈالی۔ آسمان کے یچھوں پیچ دھوپ میں ہیرے کی ہاندھ چکتا ہوا ایک پہنچا اور راتھا۔ اسد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے آنکھ کی لپکپا ہٹ سے پیالے کی تہہ میں پچھی ہوئی چاٹ کے گول دارے میں روزش پیدا ہوئی۔ اس نے پیالہ اپنے آگے بستر پر رکھ دیا۔ وفعہ، اس کا ضبط ڈٹ گیا۔

”اگر آپ۔“ اس نے دردانے سے باہر دیکھتے ہوئے مشکل کہا، ”کچھ مدد کریں، تو چند روز میں یہ کام ہر سکتے ہیں۔“

الضاف کی طلب سے، اس نے سرپا، مدد کی طلب تک، آنکھ بھیکنے کا وقفہ۔

ذوالفتخار کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ گبرے تفکر کی نظر سے اسد کو دیکھنے لگا اس نے سگریٹ کا ایک افری کش لگایا، سگریٹ کو زمین پر پھینک کر اسے چھکتے ہوئے بیاہ بُوٹ کی ایری سے ملا، اور بیٹھے سانس کے ساتھ دھوان چھوڑ کر آنکھ کھڑا ہوا۔

اس نے دوبار آہستہ آہستہ سر کو اثبات میں ڈالیا۔ ”بُوں!“ اس نے علق سے موافق آواز نکالی، اور پیالہ آٹھا کر باہر نکل گیا۔



رات کے گھپل انہیں میں درختوں کی حد پر پہنچ کر دنوں آدمی رُک گئے۔ کچھ دیر تک داں کھٹے داں کاریکی میں ڈوبے ہوئے گاؤں پر نظر دوڑاتے رہے۔ گشاد میں کوئی عرکت نہ تھی۔ پھر شاہرخ نے اپنی رائفل دہنے اتحاد سے باہمیں میں منتقل کر کے خال اتحاد آگے بڑھایا۔ ایسا نہیں کروں گو بڑھو۔“ اس نے کہا، ”ہریں تو فکر مت کرنا۔ مجھے خبر ہو جائے گی۔ خدا حافظ۔“

اس نے خاموشی سے مانچھہ ملایا اور کوئی بات کیسے بغیر کھلی نہیں پر نکل آیا۔ ہوا میں خنکی آپلی تھی۔ آہستہ آہستہ

چتا ہوا اس نظر سے سفید میدان کو پار کرنے لگا۔ ایک بار اُس نے مذکور دیکھا۔ شاہ رُخ درختوں میں غالب ہو چکا تھا۔ چار پانچ میل کے پیدل سفر کے بعد اُس کی نانگیں کمزوری سے درز ہی تھیں۔ پردوں کا چھوٹا سا بُخچہ بغل میں دبائے وہ گشہ کی دیواروں تک پہنچا۔ اچھے ایک طرف سے کٹتے نے بخونکنا شروع کر دیا۔ اُس نے رُک کر ادھر اور ہر دیکھا۔ کتابات کے انہیں ہیں عادتاً بجزم رہا تھا۔ اُس کی آواز پر گاؤں کی میں چار مختلف ستوں سے کٹتے جاتا بخونکنے لگے۔ چند منٹ تک یہ شور جاری رہا۔ کوہر سے جاؤں ہے اس نے دیوار کے پاس کھڑے کھڑے سوچا۔ اس وقت کیا کر رہی ہوگی ہے بتر پیشی ہوگی ہے سور ہی ہوگی ہے سونے کی کوشش کر رہی ہوگی ہے شاید حسین بی بی سے باقی کر رہی ہو ہے بُرھیا بھی وہیں رہتی ہوگی ہے بُرھیا کہاں جائے گی ہے اُر کی جگہ پر ہے۔ کھڑکی کی طرف سے جاناٹھیک نہیں۔ یاسکن کو خیال بھی نہیں ہو گا میں اس وقت آسکتا ہوں۔ رات کافی پُرگئی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ کیا کرے گی ہے دھڑک۔ دھڑک۔ دھڑک۔ اس کا دل تھپل اچھا کر سینے کی دیواروں پر سرٹیک رہا تھا۔

جب تک وہ فی الواقع گشہ کی گیوں میں اکھڑا ہوا تھا اُسے اس بات کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ گادر کے لوگوں کا رد پر اُس کے ساتھ کیا ہرگا۔ اب سفان دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس نے ان لوگوں کی خاموش سہلگتی ہوئی مخالفت کو، ان کی پوشیدہ جاہیت اور ان کے نگز تماریک دہقانی شبہ کو اپنے ہمیوں میں محسوس کیا۔ تھکا دٹ سے اُس کی پنڈیوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اُس نے اتحاد انجام کر اپنی چھاتی اور حلق کو سہلایا۔ دل کو خبر لئے کوئی ستش کی، لمبے لمبے سانس لیے، مگر وہ بخی پرنسے کی مانند پھر کرتا رہا۔ بیٹت تاریکہ پڑا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ دروازے کی طرف سے جائے گا، مگر دروازے پر پہنچ کر اُس نے رُخ بدلا۔ دیوار کے ساتھ دبے پاؤں چلتا ہوا کھڑکی کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ اُس نے کھڑکی کی درزوں سے انگھیں لگا کر دیکھا اندر تماریکی تھی۔ اُس نے کان لگا کر ترس۔ دھڑک۔ دھڑک۔ اُس کے دل کے دھڑکنے کی آواز تھی۔ اُر پُرخی کر اُسے خدا شہر ہونے لگا کہیں اندر یاسکن تک نہ پہنچ جائے۔ وہ واپس دروازے پر اکھڑا ہوا۔ اُس کے پیٹ کے اندر سروہی کا تشنج پیدا ہو رہا تھا اور نانگیں کا نپ رہی تھیں۔ اُس نے اتحاد انجام اچھوٹ سے محسوس ہوا کر کہیں میں خافت نہیں رہی۔ اُس نے یہک بہاسانس کچھ بخ کر ادھر اور ہر دیکھا اور رہا تھا اسکے دروازے پر رکھ دیا۔ دروازے کی سردا اور کھجور میں لکڑی کا دھلیس اُسے غُر بھر باد رہا۔ دروازے کی درزوں میں روشنی ابھری اور آواز آئی۔ ”کون ہے؟“ آواز حسین بی بی کی تھی۔

”میں ہوں۔“ اُس نے کامپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

بڑھیا نے کندھی اٹا کر دروازہ ذرا سا کھولا اور لالیٹن اٹھا کر روشنیِ اسد کے چہرے پر ڈالی، پھر کوڑھوں کی ایک طرف کو بہت گئی۔ اوپر کچھے پیچے ہوئے فرشِ دالی دیوار ہی میں کھڑی وہ اسد کو خالی خالی، بُر جھی بے پہچان نظر میں سے دیکھتی رہی۔

"یا سیکن کہاں ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"سرہی ہے۔" حسین بی بی نے یقینی اواز میں جواب دیا۔

اس نے اس کے ہاتھ سے لالیٹن پکڑ لی اور یا سیکن کے کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

"اپنے آبا کے کمرے میں سوتی ہے؟" حسین بی بی نے کہا۔

اس نے چیرت سے اُسے دیکھا اور حکیم کے کمرے کی طرف لوٹ آیا۔ دروازے پر ہاتھ رکھ کر اس نے آہستہ سے دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ لالیٹن اٹھا لے وہ کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں خواب آؤ دسانس کی بیکی بیکی حرارت اور خوشخبرتی۔ تازہ خمیری روٹی کی سی نیم گرم آسودہ خوشبو۔ لالیٹن کی روشنی میں کمرے کا نقشہ ایک دم ابھر آیا۔ ہر ایک چیز اُسی چکر پر تھی جہاں ہمیشہ سے رکھی تھی، درن بستر کے آگے چلی کا جوڑا یا سیکن کا تھا بستر پر یا سیکن موٹی ندودنگ چادر سے اونہ دھکی ابتدائی شب کی گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ سیدھی پیٹست پر پڑی تھی اور اس کا سر تکیے پر ایک طرف کو مٹرا ہوا تھا۔ ایک نیچگی میٹھے زاییے پر چارپائی کے کنارے تک چلی گئی تھی اور یہ چادر سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کے ڈھلنے ڈھالے کھلنے ہوئے، دروازہ تازہ تیل لگھے بال ماتھے اور کافنوں کو ڈھانپنے ہوئے تھے۔ نیند میں وہ بے معلوم سے بُست رفتار آسودہ سانس لے رہی تھی۔ اسد دیر تک چارپائی کے پاس کھڑا لالیٹن ٹلاہا کر، مختلف گھبروں سے روشنی ڈال کر اس کے چہرے کے سیاہوں کو محکمت کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے کبھی یا سیکن کو آرام دہ خواب کی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ اس کے رخساروں کی میریاں ابھرائی تھیں۔

اس نے حسوس کیا کہ اس کی پیٹست پر کوئی کھڑا ہے۔ اس نے مٹ کر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا، مگر دروازے پر اس سے حسین بی بی کا چہرہ نظر آیا جو اس کے مٹنے پر غائب ہو گیا۔ اس نے لالیٹن زمین پر رکھتی اور دروازے کے پاس جا کر کوڑ بند کر دیے۔ کمرے کے فرش پر دبے پاؤں چلتا ہوا وہ واپس آ رہا تھا کہ یا سیکن نے انٹھیں کھول دیں۔ ایک لمبے ہمک ودبے نظر می سے چھت کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اسد کو دیکھا اور جھنکے سے سانس کھینچ کر اٹھا بیٹھی۔ خوت کے درے اس کے منہ سے ایک جنم نا آواز بیکل جے اس نے فرمائنا پر باقاعدہ رکھ کر دیا۔ اس نے مٹری جو لی ناگہ کوچھنگ رہ دی رہی ٹانگ کے برابر رکھا اور پسندنے چھانی سے لگا کر، ایک ہاتھ مٹنے

پہ اور دوسرا لگے پہ رکھنے، پھٹی پھٹی وحشی نظر دن سے اسد کو بچتی رہی۔ اس کی مانگوں کی تھکادٹ اور بدلت کی لرزش غائب ہو چکی تھی۔ اس کا دل ٹھہر گیا تھا اور وہ چار پائی سے ایک گز کے فصلے پر آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑا پکھے بلکے سانس لے رہا تھا۔ اس کے پیٹ کا تنقیح حرارت کی لمبنتے پھلا دیا تھا۔

”اسد۔“ یاسمین نے سرگوشی کی، جیسے اپنے آپ کو بتا رہی ہو۔ پھر وہ درپر کرتے رکھنے کی وجہ سے اس کے گھبری اواز نکال کر اس کے بہت قریب آ کھڑی ہوئی۔ انھوں کی طرح منہ اٹھا کر اس نے ماخنوں سے اس کے چہرے کو ٹوٹا شروع کیا۔ ناک۔ منہ۔ انکھیں۔ بال۔ پھر کندھے۔ بازو۔ سینہ۔ پھر کمر۔ کمر کے گرد باروں۔

”اسد می۔“ وہ بولی۔ اس کی اواز حیرت ناک طور پر پسکون تھی۔ ”تم آگئے ہو ہے“ مگر اس کے اتھ، اس کے لب اُسی طرح مضطرب، بے اعتماد، بے قرار رہے۔ اس کا ایک پیر لالیں کے تپے ہوئے شیشے سے لگا اور وہ ”سی“ کر کے ایک طرف کو چل گئی، مگر اس نے مذکورہ دیکھا نہ اس کے ماخدا تھے، نظریں سامنے مرکوز رہیں، جیسے عمدات کی حالت میں اس کی ٹھوکر سے لالیں اوندوں ہو گئی تھی اور جپنی سے شیشے کا ایک گول ٹکڑا توڑ کر علیحدہ ہو گیا تھا، جس میں سے بتی بیاہ دھوائی اگل رہی تھی۔ کچا تیل جلنے کی بُوا اس کی ناک میں پہنچی توڑہ چونکا۔ لالیں کی کپی کا ڈھکنا ڈھیلا تھا اور اس میں سے تیل رس کر زیبی پر بہر رہا تھا۔ اس نے جھک کر لالیں سیدھی کی اور سوراخ میں پھونک دا کر تی بھادی۔ پچھے دھوئیں کی بُوا ہستہ اہستہ اندھیرے میں تحلیل ہونے لگی۔ یاسمین کے ماخنوں کو روشنیاں لگی تھیں، جن میں دیکھ بھال کرو، اس کی پہچان کر رہی تھی۔ ”اسد می۔“ وہ اس کے ساتھ پڑ کر دھرمی، متوازن اواز میں دنے لگی، جیسے عام ہجے میں کوئی بات کر رہی ہو۔



”اسد می۔“ یاسمین نے کہا۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“
”پچھو بھی نہیں۔“ اس نے ہمس کر جواب دیا۔ ”یہی معمیک ٹھاک ہوں۔“
اسد اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اور اس کے پٹ کھول کر اہر، کینے لگا۔ پوچھٹ رہی تھی۔ مشرقی آسمان پر اچالو

تھا، اور آسمان کے اندر پھر کی چوڑیوں کی کٹی بھی، اور سمجھی پچھی لکیر رہی شوخ اور واضح ابھرتی چلی آرہی تھی۔ دو میں طرف کو ایک چوٹی تھی جس کے قریب ایک گاؤں واقع تھا، اور کم بھی کبھی چونی کی لکیر کے اوپر کوئی بجھی یا کوئی مجھیڑا جلے آسمان کے مقابل نہیں سے سیاہ پتھر کے بُت کی مانند کھڑی نظر آ جاتی تھی۔ پھر ایک چوٹی کے پاس بودو باش رکھنے والے یہ رُگ اسد کو بے حد انبیٰ لگتے تھے، جیسے کوئی عینہ ملک ہو۔ انسنی اونچائی پر، اگل تھلک۔ برف اور برفانی ہوا یہیں اور دشوار گزار راستے، اس نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے سوچا، گرم فوپیاں، مری مرنی گالوں والے نپے۔ رامب

گاؤں

مغرب کی جانب آسمان ابھی سیاہ تھا۔ پھر کا مہرباں، تاریک جنہی آسمان کے اندر سے بہت مدھم دمدم ابھر رہا تھا۔ اسد نے دو میں بلے بلے سانس لیے اور صبح کی ہوا کر اپنے چہرے پر چلتے ہوئے محسر کیا کھڑے کھڑے اس کی ٹانگوں کو سردی لگنے لگی تھی۔ وہ کھڑکی سے رُٹ آیا۔

یاسین پہلو کے بل لیٹی، سر ما تھا پر اٹھاتے اسے بستر کی طرف آتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”تمہارے گھنٹے بجتے ہیں۔“ وہ شرارت سے بنسی۔

”نہہ بچا۔“

”چلتے ہوئے تمہارے گھنٹے ایک دوسرے سے بجتے ہیں۔“

”کہاں بجتے ہیں؟“ وہ جھینپ کر بولा۔

”دیکھو۔“ وہ ہنسی، یہیں نے آج دیکھے ہیں۔“

اسد اگر اس کے برابر بیٹ گیا۔

”اسدی۔“ یاسین نے اس کی ٹانگوں کو چادر سے دھک کر کہا۔

”ہوں۔“

کھڑک کے راستے آسمان کی بلکی ملکی روشنی اسد کے سر پر ڈرہی تھی۔

”سُوروں نے، وہ روئی ہوئی غصہ ناک آواز میں بولی،“ تمہارے ساتھ کیا کیا ہے۔“

اسد اس کے اٹھے ہوئے کندھے پر ہاتھوں لگتے اسے دیکھتا رہا۔

”سولہ دن میں تمہاری ٹڈیاں بچل آئی ہیں۔“

”سولہ دن ہوئے ہیں؟“

”ہاں۔“ یاسین کا ماتھا اس کی پلیوں پر رکھا رکھا کپکپا رہا تھا۔ ”چھپے سے پچھپے منگل کو تُم کئے تھے۔“

آج پڑھے۔"

ایک دو تین چار پانچ اسد لون کا حساب کرنے لگا۔

"کیا گن رہے ہو ہے"

"دن؟ اس نے کہا۔ ساتویں دن تک مجھے یاد ہے۔ میں نے دلوں کا حساب رکھنے کی کوشش کی تھی۔

پھر دن کیا جانا:

"پوچھ گچھ۔" وہ بولا۔

"کبھی پوچھ گچھ۔" اس کے بھے میں تجسس تھا، تمہیں یاد ہے ہے؟"
"اں"

پوچھ دیروہ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ "کبھی پوچھ گچھ ہے؟" اس نے دُبرا کر پوچھا۔
اسہ خاموش رہا۔

"تباو۔" وہ بولی۔ پھر اپنے سوال پڑھان ہو گئی۔ اس نے ہاتھ آٹھا کر اپنا بازو اس کے سینے پر دال دیا اور اس کے کنسے پر سر کو کریٹ گئی۔

"میں ہر وقت سرچارن تھی تم اب کیا کر رہے ہو گے، کیا سوچ رہے ہو گے۔ بس اس لیے پوچھتی ہوں گی
اور کوئی بات نہیں۔"

اسد لیا لیسا کہ سایا۔ "پھر تباو گا۔" اس نے کہا۔ "مجھے یاد ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بندھی سے بولی۔ "میرا پوچھنے کا مطلب نہیں۔ میں نے تو صرف پڑھا ہی ہے پوچھنا
میں کیا ہرجن ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں۔" وہ آہستہ سے جسا، تم کیا سرچارن تھیں؟"

"میں سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی تھی۔ اسد ہی، یہ پوچھ رہے۔ کبھی ایک بات سوچتی کبھی دوسری۔ آفریرے
ماخ میں کچھ بھی نہ رہتا۔ یہ سے لگتا ہیے خالی ہو گیا ہے۔ تمہارا دماغ کبھی خالی ہوا ہے؟"

"اں۔"

"جب دل سے کوئی بھی نہیں ملختی ہے ہر وقت ماخ میں بوا کا گولہ بھرا رہتا ہے؟" اس نے پوچھا
"اں۔" اس نے کہا۔

”ایے لگتا تھا جیسے ہر چیز ملتوی جو گئی ہے۔ یا چیجے رہ گئی ہے۔ وقت تھم گیا ہے۔“
اسہ اُس کی بات پہچان کر حونکا۔ اُس کی انکھیں نیم تاریکی میں چکیں۔

”اُچھا ہے۔ اُس نے خوشی سے پُرچھا، مگر دیسے پاٹ ہجے میں، گرم جوشی کے بغیر، تمہارے لیے بھی؟“
”میرے لیے بھی ہے۔ یا سہن نے بے خیال سے پُرچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولا، ”وقت۔“

”وقت کیا ہے؟“

”تھم گیا تھا ہے۔“

”ہاں۔“ یا سہن نے کہا، ”جیسے وقت رُک جاتا ہے۔ نہ آگئے چلتا ہے نہ پیچے۔ نہ پچھا جاتا ہے۔ جیسے سرپ کا تار ٹڑ جائے۔“

”ہاں۔“ اسہ نے کہا۔

”میرا دل کرتا تھا دیوار سے مکر مار کر اس ہوا کے گرے کو پاش پاش کر دوں۔ تماک کچھ بیاد آئے۔ کرنی خبر ملے نہ بلے، کرفی خیال ٹوٹے۔“

”ہوں۔“ اسہ نے اثبات میں سر لایا۔

”اسی لیے پُرچھتی ہوں۔“ یا سہن نے کہا۔

”پھر بتاؤ گا۔“ اسہ نے کہا۔ یا سہن نے ہاتھ درکھ کر اُس کا نہ بند کر دیا۔ اسہ نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دھانپ لیا۔ اسہ ارام سے یعنی چلت کو، اور یا سہن اسہ کو دیکھتی رہی۔ دن کی روشنی دیکھنے دیکھتے بُرہ رہی تھی اور چلت کی سایہ دار جگہیں ایک ایک کر کے اچھے میں آتی جا رہی تھیں۔ چند لمحے کی گہری غیند نے اُس کے اعضا کو آسرو د کر دیا تھا۔ اُس کے بدن میں اس وقت مسکن ضبط کا احساس تھا۔

”وُدھرے دن۔“ اسہ نے اسی دیسے پاٹ ہجے میں بات کی، ”میں نے تمہارا بیان دیکھا۔“

”میرا بیان ہے۔“

”جو تم نے دیا تھا۔“

”کیا تھا؟“ وہ بولی۔

”نم بتاؤ۔“ اسہ نے کہا۔ تم نے کیا بیان دیا تھا؟“
یا سہن چند لمحوں تک غور سے اسہ کو دیکھتی رہی۔ پھر جلد بلند برلنے لگی، ”تمہارے جانے کے لگنے دن

نخانیدار اور ایک سپاہی آئے صحیح سورے۔ کہنے لگے کچھ دوچھ پچھ کرنے ہے۔ یہیں نے ان کو بُھایا۔ تمہارا میں نے پُچھا۔ کہنے لگے تم دہلی سے آدم سے ہو، ابھی بیان مکمل نہیں ہوا، کچھ داگری رپورٹ کا منتظر ہے، ایک آدھ روز یہیں فارغ ہو جاؤ گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ جب کئی روز تک تم نہ آئے تو پھر اس وقت میرے دل میں خیال آئے جسے بند ہو گئے.....”

”تمہارا بیان ۔ اسے بے صبری سے پُچھا۔“

”جب یہیں تمہارے متعلق پُچھر گئی تو انہوں نے اپنے سوال شدود ہجے کیے۔ ابا کے بارے میں ماہی، کہاں سے آئے، کہاں رہتے تھے، کیسے کام کرتے تھے، اس کس سے میں جوں تھا، یہیں دین دعیرہ دعیرہ۔ بہت سی باتوں کا بھی پتا ہی نہ تھا، کوئی زیادہ جزو درج نہیں کی، جو یہیں بتاتی گئی لکھتے گئے۔ قتل کی رات کے، دہ رُک، داقدات تمہارے بارے میں بڑی تفصیل سے دریافت کیا۔ تمہارا عادضہ، دوا دعیرہ۔ پہلی بار کتنا عرصہ ہے، کب گئے، کیوں گئے، کب و اپس آئے۔ میرے اور تمہارے بارے میں ...“ ذہر کر خاموشی سے اسد کو دیکھتے گئی۔

”تم نے کیا کہا؟“

”حر بات تھی یہیں نے تباہی۔ جو بات انہوں نے پُچھی ہیں نے اس کا جواب دے دیا۔“

”تم نے اپنا بیان پڑھا تھا؟“

”نہیں۔ نخانیدار نے میرے آگے کیا تھا، مگر یہیں نے نہیں پڑھا۔“

”کیوں نہیں پڑھا ہے وہ خصہ دبا کر دولا۔“ تمہارا فرض تھا اپنا بیان لے کر پڑھیں۔“

”میرے سامنے تو وہ لکھ رہا تھا۔“ یا سہیں تھیں کہ لکھ کر لولی، جیسے جیسے یہیں بولتی جاتی تھی وہ لکھا جاتا تھا۔ میرے خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس میں کوئی رد و بدل کرے گا۔ ان کا مقصد مجرم پکڑنا تھا۔ یہیں اور تم دونوں گواہ ہیں۔“

”تم نے انہیں تباہا کہ جب میں اس رات کو مطب میں گیا تو تم میرے ساتھ نہیں تھیں بلکہ میں اکپلا تھا۔“

”نہیں۔ یہیں نے اپنے بیان میں وہی لکھا یا جو پہلے دن کہا تھا، کہ جب تم نے مطب میں روشنی دیجی تو یہیں تمہارے ساتھ تھی۔ انہوں نے اس بات کو کھینچا نہیں، یہیں نے اور کچھ کہا نہیں۔“

”پھر کس نے انہیں اس بات کی خبر دی ہے؟“

”پتا نہیں۔ مگر سارے گاؤں میں تفتیش کرنے پھرے ہیں۔“

”میر حسن گاؤں میں ہے؟“

”نہیں۔ بھاگا ہوا ہے۔ تباہے اس کے باپ نے اس ذرستے کا اس پرشہ بھگا اپنے جان کے پاس بچھ دیا ہے۔ یہ بھی افواہ ہے کہ سرحد پار کر کے نکل گیا ہے۔“

”پولیس والوں کو علم ہے؟“

”ضرور ہوگا۔ سارے گاؤں کو علم ہے۔ تھانیڈار مجھے بار بار مجبور کرنا کہ کوئی میں اپنے ذہن پر زرد دسے کر سوچوں اور جہاں تک ممکن ہو کسی پرشہ بھاہر کروں۔ میرے آگے اس نے کتنے ہی نام لکھے۔ مل بغاٹ۔ میر حسن۔ خوشی محمد۔ مگر میں نے کسی کو.....“

”خوشی محمد؟“ اسد چونکا۔

”وہی کتنا تھا۔“ وہ جو شے سے بولی، مگر اس وقت میں نے

”خوشی محمد کا نام تم نے سمجھو رکھا تھا۔“

”نہیں۔ خوشی محمد پر اس وقت بھی ان کا شہر تھا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں کسی نہ کسی طرح اس پر اٹکلی رکھوں۔ مائے اسد، میں نے کتنی بیوقوفی کی حس و قلت اگر میں“ وہ باقی میں کرتے کرتے رد نے لگی۔

اسد کے ذہن کی فضای صاف اور پرپکوت تھی۔ اس کے تجسس کی شدت اس دصب کی تھی جیسے اس کے نہیں کسی اور کے بارے میں بات ہو رہی ہو۔ اس نے پہلا تھہ بایسیمن کے کندھے سے اٹھا کر اس کی پشت پر رکھ دیا۔

”چپ کرو۔ رد تو نہیں۔“ اس نے زمی سے کہا، سوچ کر بیا۔ خوشی محمد کے اوپر ان کا شہر کس پہاڑ پر تھا؟“

”یہی کہ وہ عادی چور تھا۔“ بایسیمن نے چادر سے آنھیں خٹک کیں، پہلے بھی سزا یافتہ ہے۔“

”تمہیں پتا ہے کہ اس کے کچھ پیسے تمہارے اباک طرف نکلتے تھے؟“

”نہیں۔“ بایسیمن نے کہا، ”نکلتے تھے؟“

”تباہی ہے۔“

”کس سے؟“

”شاہ رُخ سے“

”ملکتے ہوں گے۔“ یاسین نے کہا، ”اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے اُس کا لین دین رہتا ہی تھا۔ کبھی اُس کے پیسے رہ جاتے تھے، کبھی وہ چیلگی بھی لے جاتا تھا۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟“

”پچھے نہیں۔“ اسد نے کہا، ”یہ بتاؤ، تمہیں اچھی طرح سے یاد ہے کہ خوشی مختہ پر پولیس نے پاٹشہ پر ظاہر کیا تھا؟ یعنی اُس وقت ہے تمہارا بیان یعنی کے وقت؟“

”ماں۔ اُس کے بعد وہ آئے ہی نہیں۔ گاؤں میں آتے رہے ہیں، مگر میرا ان سے سامنا اُس کے بعد نہیں ہوا۔“

”میرے جانے سے لگے روز ہے؟“

”ماں۔ تمہارے جانے سے لگے روز،“ اُس نے پہلی بار حیرت سے اسد کو دیکھا، یہوں کیا بات ہے؟“

”پچھے نہیں،“ اسد نے سکون سے کہا، ”آگے بتاؤ۔“

”پھر۔“ یاسین اپنی یاد کو سیٹتے ہوئے ایک لمحے کو ڈرکی، ”بس پھر میرا بیان ختم کرنے کے بعد اُس نے پوچھا کہ کوئی اور بات رہ گئی ہے جو میں کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا نہیں۔ پھر میں نے دوبارہ ان سے تمہارا پوچھا۔ تھائیڈار نے مجھے تسلی دی۔ حرامزادہ کہا۔ وہ بلک پڑھی۔ اسد نے اُس کی پشت پر اپنا ہاتھ دبا کر اُس کی آواز کو تمہارا دیا۔ کہنے لگا تفہیش مکمل کرنے میں تمہاری مدد کی ان کو اشد ضرورت ہے، ایک دو روز میں تم واپس آجائو گے۔ ماں، بیان ختم کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ ممکن ہے عدالت میں میرے گواہی کی ضرورت پڑے۔ میں گواہی دینے کے لیے تیار ہوں ہے میں نے کہا تیار ہوں۔ بس پھر وہ چلے گئے؟“

”تراخ۔“ اسد کے دماغ میں بلا وجہ ایک پہنچے دار آواز اجھری۔ اُس کے دل میں غصہ ایک بار پھر سر اٹھا رہا تھا۔

”بس؟“ اُس نے پوچھا۔

”بس۔ اس کے بعد وہ نہیں آئے۔ میں کئی روز تک تمہارا انتظار کرتی رہی۔ ہر روز میں سوچتی۔“

”بندوق ان کے ہاتھ کیسے ملے؟“

یاسین کا ماتھ تیزی سے اپنے بیرون تک گیا۔ اُس نے ایک بلکا سا سافس کھینچا۔ چھوٹی سی ہائے کی آواز اُس کے منہ سے ملکی۔ وہ مجھے یاد بھی نہیں رہا۔ سب سے پہلے انہوں کے ہی تھائیڈار نے کہا وہ کروں

میں گھوم پھر کر جائے رہا شکا ملا حظ کرنا چاہتا ہے۔ جائے رہا شکی اس کے نظر تھے، مجھے یاد ہیں مجھے کرفی اختراض ہے، میں نے کہا نہیں۔ میں نے سمجھا سرسری نظر دلے گا۔ مگر انہوں نے ایک ایک چیز کر کر پڑ کر ناشرعاً کر دیا۔ تمیزوں کروں میں، باور چی خانے میں، غسل خانے میں، بھن میں، ہر جگہ پہنچ کر ایک ایک چیز کر اتحل تحل کیا۔ بندوق تک پہنچے تو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتے، کھوں کر اسے جڑا، کندھے سے لگا کر سیدھی کی، بارہی بارہی دلوں نے دے ہاتھ میں اٹھا کر نالی کے لند نظر وال کر دیکھا۔ پھر کھول کر ڈلتے میں بند کر دیا۔ پوچھنے لگا کب سے یہاں پڑی ہے، میں نے کہا مجھے علم نہیں، شاید شرعاً سے یہیں رکھتی ہے۔ اسدی، میں نے اُن کے ساتھ ایک بی جھوٹ بولا ہے، مگر مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ لائن کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے کہا مجھے کچھ خبر نہیں۔ آپ کے کمس میں ڈھونڈا، صندوقچی میں لکھا چھڑا ہر جا کر مطب کی الہاری میں تلاش کرنے لگے تو ایک مرتبان کے اندر سے ملا۔ کہنے لگا اس کی میعاد ندت ہوئی پوری ہو چکی ہے۔ بندوق بہر حال واپس مال خانے میں جائے گی۔

”کہیں چھپائی نہیں جاسکتی تھی؟“ اسد نے پوچھا۔

”ایک ایک چیز گھر کی تو انہوں نے کھنکاں دی تھی۔ آجی بڑی چیز کو کہاں چھپائی؟“

”ذماں کی برباد تو اٹھا کر نہیں دیکھی جوں گی۔“

”اٹھا کے نہیں دیکھیں، مگر آگے پہنچے سب جگہ نظر ڈالی۔ پھر مجھے کہ کیا خبر تھی کہ وہ گھر کی تلاشی میں گئے؟“ پھر وہ بولی، ”اچھا ہوا جو لے گئے۔ مجھے کسی سے کیا خطرہ ہے؟“

”مزارخوں سے کیا جھگڑا ہوا تھا؟“

”کوئی جھگڑا اوڑا نہیں تھا۔ گائے کا دودھ دو دن میں سات میرے چار سر رہ گیا تھا۔ میں نے جیزے سے کہا کہ دودھ دو دھر کر رہے ہیں، اگر بے ایمان کریں گے تو میں گائے کسی اور کے جو لے کر دوں گی تھوڑی دیر کے بعد جیم آیا۔ کہنے لگا: میں نے اُن پر بے ایمان کا اذام لگایا ہے۔ میں نے کہا اگر تم عرام کا دودھ پیتے ہو تو بے ایمان ہو۔ اذام کی کیا بات ہے۔ میں نے دانت کر واپس بھیج دیا۔ لگئے روز شاہ رُخ آیا تو کہنے لگا اس نے جیم کو بلا کو دھرم کایا ہے۔ میں نے تو اس سے بھی کہا کہ پیچ میں اُنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان لوگوں سے ڈلتی نہیں۔ میرے کوئی نادائقٹ روک تو نہیں۔ سارے غرے سے ان کو جانتی ہوں۔“

”پھر مجھی،“ کچھ دیر بعد اسد نے دصندلائی بُرُقی آواز میں کہا، ”ہمیاگھر میں رہتا تو اچھا تھا۔“

”یا سہیں اس کے کندھے پر سر کھو کر لیٹ گئی۔“ اسدی، ”وہ رد کر بولی، ”چھوڑ دکس بات کو۔“



”یہ کیا ہے؟“ یاسین چونک کر بولی، نامے اسدی! یہ دیکھو: اس نے اس کا سر کمپ کر دشمنی کی جانب بٹرا۔

”کیا ہے؟“

”سفید بال، یہ دیکھو:“ وہ اس کا سر کمپ کر آئے دکانے کی کوشش کر رہی تھی، میوں جیسے اس کا سر نہ ہو بلکہ لٹھنا ہو۔ تمہارے سر میں سفید بال،“ ایک دو تباہے سر میں کتنے ہی سفید بال ہیں۔ یہ کہاں سے آئے؟“

”کوئی نہیں ہیں۔“ وہ کہا۔

”ہیں۔ ہیں۔ یہ دیکھو۔“

”ہیں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟“

یاسین اس کے بالوں کو انگلیوں سے تیر تیر لئتی پڑتی رہی۔ پھر اس نے چادر کے نیچے ہاتھے جا کر پاس درست کیا اور کوڈ کریتر سے انٹھی۔

”دیکھو:“ وہ انتروالا شیشہ یہے اس کے اور پر جھکی تھی، نامے اسدی؟“

اسد ماتھے پر تیوری ڈلے۔ ایک ہاتھ میں شیشہ ہے، دوسرا کی انگلیاں بالوں میں پھیڑ پھیر کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر میں جگہ جگہ پسفید بال نکل آئے تھے۔ تیکے کے اور پر کھا ہوا اس کا چہرہ اُسے عجیب ساد کافی دے رہا تھا۔ یہ روز پہلے اس نے ذوالقدر کے گھر پر دار ہی منڈی تھی۔ اس کی انگلوں کے کنارے ذرا ذرا سوچے ہوئے تھے۔ چند منٹ پہلے وہ دونوں اس رات میں دوسری بار سوکر جا گئے تھے۔ اب سورج بکل آیا تھا۔

”شاپ پلے سے ہوں۔“ اسد نے کہا۔

”یہ نے کبھی نہیں دیکھے؟“

”تم میرے ساتھ کبھی سوئیں بھی تو نہیں۔“
یاسین کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ”میں نے کبھی نہیں دیکھے۔“ وہ بولی، ”میں تمہارے بال بال کو جانتی ہوں۔“

”شاید ابھی نکلے ہیں۔“ وہ ہنسا، ”کل رات کو ایک بھی نہ تھا۔“
یاسین فیصلہ نہ کر پائی کر دے ہنسے باروئے۔ اس نے اسد کے ماتھے پر زخم کے نشان کو چھوڑا۔ اسے
کام تھا کہ رانچیوں سے کھلتے رکا۔ وہ اس کے پاس چار پائی پڑھ گئی۔
”میرے بس میں ہوتا ان کی جان مار دوں۔ بے انعامات۔ ظالم۔“ یاسین نے کہنیوں کے بل جھک
کر اپنی سانکھیں اس کے بالوں میں چھپا دیں۔

پس کرے کے باہر ہسین بی بی کے چلنے پھرنے، کوارڈوں کے بخشنے اور ہنگوں کے کھٹکنے کی آوازیں آرہی
تھیں۔ کھڑکی میں، آسمان پر دھوپ کی چک تھی۔ اس نے اس کے بالوں کو گد گدا دیا۔

”اب باہر کیسے جاؤ گی؟“

”کیوں؟“ وہ سڑاٹھا کر بولی، ”کیوں کیسے جاؤں گی؟“

”ہسین بی بی کیا کہے گی؟“

”کیا کہے گی؟“ وہ سڑھک کر بولی۔

”جاو۔ پھر جا کر دکھاو۔“

”لو ابھی جاتی ہوں۔“ وہ ہلی، جیسے اٹھ کر جا رہی ہو، مگر اسی طرح گہنیاں اسے کے بازو پر رکھنے
چکتی رہی۔ اس کی سانکھوں کے گرد آنسوؤں کی فی تھی، مگر ہنڑ مبتسم تھے۔

”ابھی جا کر دکھاتی ہوں۔“

”جاو۔“

وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی دراز سے پر جا کر ڈک گئی۔ اس نے اٹھا کر گندھی پر رکھا اور کان لگا
کر باہر کی آواز سننے لگی۔ پھر اس نے مرکے ایک چھٹکے سے ایک شون، مبتسم نظر اس پر ڈالی اور بھاگتی ہوئی اگر
بستر پر گر پڑی۔ اس نے چادر اٹھا کر اور پر اور ڈھلی اور اس کے انہے گیند سی بن کر ساکت ہو گئی۔ اس نے اسے گر گدا نا
شروع کر دیا۔ چادر میں لپٹی ہوئی وہ گیند سی چار پائی پر لوٹنے لگی۔

”نہ نہ۔ نہ کرو۔ اسے۔“

"جاو۔ اب جاتی کیوں نہیں۔ جاؤ۔"

"ابھی میرا دل نہیں کر رہا۔ اس دل خدا کے لیے نہ کرو۔"

"ہاں۔ خدا کے واسطے ٹھیک ہے۔ اب نہیں کرتا۔"

پچھے دیر تک وہ بے دم ہرئے ساتھ ساتھ لیئے رہے۔ دھوپ کی رنگت نیلی ہو گئی ہے، اسد نے سوچا۔ چڑی کے جھکلوں کی زمین پر دھوپ کی دھا ریاں پڑی ہوتی ہیں۔
یاسیں نے سراس کی طرف موڑا۔

"اسدی، کیا سوچ رہے ہو؟"

"پچھو نہیں۔" اسد نے کہا۔

"پچھے تو سوچ رہے ہو۔"

"یہیں نے ذرا الفقار سے وعدہ کیا ہے کہ دو دن سے زیادہ بیہاں نہیں رہوں گا۔"

"اوہ۔" یاسیں اس طرح اچلی جیسے کسی نے اس کے خنجر گھونپ دیا ہے۔ " وعدہ! تم نے کیوں ایسا وعدہ کیا ہے اُس کے ساتھ۔ تمہیں کوئی وعدہ کرنے کی خردت نہیں۔ تم نے کیوں وعدہ کیا ہے؟ اسے کیا حق ہے تمہیں بیہاں آنے سے روکے؟"

"اُس نے کہاں روکا ہے۔ اُس نے تو ملکہ بیہاں آنے کی اجازت لے کر دی ہے۔"

"اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ تم یہ صہی بیہاں آجاتے۔ دیکھا جاتا پریس کیا کرتی ہے۔"

"پریس کے ساتھ چھپڑنے میں کوئی فائدہ نہیں۔" اسد نے کہا۔

"فائدہ! فائدہ کس بات میں ہوتا ہے؟ ایک بد انہوں نے زیادتی کر لی ہے تو یہ مطلب نہیں کہ اب انہیں کھلی چھپڑی ہے۔ تمہیں بیہاں آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ کسی قانون سے تمہارے اوپر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ قابل کچڑا چاچکا ہے۔ تم ایک گواہ ہو۔ تمہاری موجودگی بیہاں پر ضروری ہے۔ پہلی بار تو مجھے کچڑا خبر نہیں ہوئی، گھبراہٹ میں میرا دل نہ ہو گیا تھا۔ اب کچڑ کر کے دیکھیں۔ منتظر آباد کے سب سے نبے دیکھیں کی جی بیڑے ساتھ سکول میں پڑھتی رہی ہے۔ اس کو بیہاں نہ لے کر آؤ تو میرا نام نہیں۔ ایک گھنٹہ بھی تو تمہیں رکھ کر دیجیں۔" اسد کی متوازن نظریں اُس کے چہرے پر مخہری تھیں۔ تمہارا یہی روپ، اسد نے دل میں کہا، سرکشی کا رد پا۔
میرے دل کی حرارت کا حامی ہے۔

”ہم یہاں سے جا بھی تو سکتے ہیں“ اسد نے کہا۔

جواب میں یاسین کی تصریح دھنہ لاسی کیئیں۔ ہاں بگر بھاگ کر نہیں۔ یہ ہمارا گھر ہے۔
”تمہارا گھر ہے۔“

”تمہارا بھی ہے۔“ وہ بولی۔ اسدی ہے۔

”ہاں۔“

”تمہارا بھی ہے۔“

”میں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتا۔ کبھی کبھی مجھے یہاں سے جانا ہی رہو گا۔ جتنی جلدی چلا جاؤں اچھا ہے۔ تم میرے ساتھ کیوں نہیں جا سکتیں ہے۔“

”جا سکتی ہوں۔“ یاسین نے ہو لئے کہا، ”مگر یہ میرا گھر ہے۔“

”گھر کیا ہوتا ہے۔ جہاں پر تم خوش رہو وہی تمہارا گھر ہوتا ہے۔ یہاں پر کیا تم خوش رہو گی؟“ یاسین دیرہ میں نظریں جمائے چھت کو دیکھتی رہی۔

”پتا نہیں۔“ پھر وہ بولی، ”مگر یہ کے علم ہے کہ میں یہاں ناخوش رہوں گی؟“

”تمہیں۔“

”اوہ ہوں۔“ اس نے آہت سے نفی میں سر بلایا۔ مجھے یہ علم ہے کہ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہوں گی۔“

”پھر۔“

”مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ میں خوش رہوں گی؟“

”محب منطق ہے۔ ہر یہ بیرونی خوش رہو گی تو میرے ساتھ خوش رہو گی۔ سیدھی بات ہے۔“

”یہ سیدھی بات ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”اسدی یہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے بغیر میں مر جاؤں گی۔ یہ سیدھی سی بات ہے۔ مگر تمہارے ساتھ میں کس طرح رہوں گی، اس کل مجھے خبر نہیں۔“

”کیوں؟“

یاسین کھڑکی کے باہر آسمان پر نظر والی کرنوںی: ”گمشدہ چھوٹا کر تمہارے ساتھ کہیں پہل جاؤں تو خوشی کی